مولانا محمد حنیف ندوی

اساسیاتِ اسلام

(۵)

تعبیرِ فرد

یہودیت اور عیسائیت میں ایک مشترکہ نقص استناد (AUTHORITY) میں لچک کا فقدان ہے ۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ معاشرہ کی شیرازہ بندی کے لیے استناد کا ہونا ضروری ہے یہ بھی صحیح ہے کہ پہلے پہل استناد ہی نے انسان کو تہذیب و ثقافت کی رنگارنگی سے آشنا کیا ہے لیکن تعبیر و تشریح کے لحاظ سے اس کو بے لوچ ہرگز نہیں ہونا چاہیے ۔ انسان جس طرح یہ چاہتا ہے کہ سیاسیات میں اس کا حصّہ ہو ۔ عمرانیات میں اس کی کوششوں کو سراہا جائے ۔ اور علوم و فنون کے ارتقا میں اس کی فکری ترکتازیوں کو تسلیم کیا جائے ، ٹھیک اسی طرح اس کا یہ تقاضا بھی صحت و معقولیت لیے ہوئے ہے کہ جس دین کو یہ مانتا ہے ، جس دین کے لیے اس نے زندگی وقف کر رکھی ہے اور جس دین کو وہ ابدی صداقت کا درجہ دیتا ہے ، بدلتے ہوئے حالات میں اس کی تعبیر و تشریح کا حق بھی اسے حاصل ہو تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ جن تصوّرات پہ یہ ایمان رکھتا ہے وہ ہر ہر دَور میں انسانیت کے لیے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں ۔ یہاں سوال دراصل صرف شخصی استحقاق کا نہیں ، خود دین کی حفاظت و بقا کا بھی ہے ۔ ظاہر ہے کہ انسان کی ذہنی و علمی سطح ہر زمانہ میں برابر بدلتی رہتی ہے ۔ خود انسانی معاشرہ بھی ٹھس یا بے جان یکساں ہے ۔ اس میں بھی ایک طرح کی زندگی اور ایک طرح کی آرزوئے تکمیل ہے جو اس کو آگے بڑھاتی اور نت نیا روپ عطا کرتی رہتی ہے ۔ ان حالات میں اگر قانون یکسر بے لوچ ہو یا استناد کی سنگینی تغیرِ احوال کا ساتھ نہ دے سکے اور نئی نئی تشریحات کا بخندہ پیشانی استقبال نہ کر سکے تو طبیعتوں میں بغاوت کا پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے ۔

کچھ اسی نوع کی ذہنی مجبوریوں کے پیش نظر مغرب میں مذہب فطرت (Natural Religion) کی بنیاد پڑی - فرانس اور انگلینڈ میں خصوصیت سے اس تحریک کو بہت فروغ حاصل ہوا اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ انسانی ذہن کو استناد اور اذعانیت (DOGMTISM) کی بے رحمیوں سے نجات دلائی جائے - اس کے موٹے موٹے اصول یہ تھے :

(۱) اللہ تعالیٰ کو بغیر کسی دینی کتاب کی منت پذیری کے ماننا چاہیے -

(۲) اخلاق قانون اور روحانی اقدار کو عقل اور انسان دوستی کے پیمانوں کے مطابق وضع کرنا چاہیے -

(۳) تمام وہ دینی حقیقتیں جو عالمگیر ہیں، انسان کے قلب و ضمیر پر پہلے سے فطرت کی جانب سے نقش ہیں -

(۴) انسان ایک وسیع تر بھائی چارے سے تعلق رکھتا ہے - اور اس بنا پر یہ بجائے خود ایک برادری اور جتھا ہے - جس کو استناد و اذعانیت کی ستم ظریفیوں نے خواہ مخواہ مختلف کیمپوں میں تقسیم کر رکھا ہے -

اس کے علمبرداروں میں ژان بودین (JEAN BODIN) بہت مشہور ہے - اس نے ۱۵۹۳ میں مذہب فطرت کے بارہ میں بہت کچھ لکھا، جو اگرچہ اس وقت چھپ نہ سکا، تاہم سترھویں اور اٹھارویں صدی کے پڑھے لکھے حلقوں میں ان تحریروں کا خاصہ چرچا رہا، اور ۱۸۴۱ میں کہیں جاکر ان کا ایک خلاصہ چھپا اور وہ بھی ترجمہ کی صورت میں - اس تحریک کا دائرۂ اثر کس حد تک وسیع تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ۱۷۷۵ میں ہنری چہارم جیسا شخص پکار اٹھا جو عیسائیت پر پختہ یقین رکھتا تھا کہ جو لوگ دیانت داری سے اپنے ضمیر کی آواز سنتے ہیں، میرے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور میرا مذہب وہی ہے جو تمام اچھے اور باضمیر لوگوں کا مذہب ہے[۱]-

بودین یہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ خدا کا انکار کریں اور مذہب فطرت کی آڑ لے کر خواہشات نفس کی پیروی کرنا شروع کر دیں - اس کے برعکس اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ لوگ ڈھلے ڈھلائے

۱ھ ہسٹری آف ماڈرن فلاسفی - ہائی ہفڈنگ پہلی جلد ص۲۰

۲ھ ایضاً، ص ۶۲

دینی عقیدوں کو چھوڑ دیں اور بجائے قانون، آئین اور کتاب کے ضمیر و قلب کی پاکیزگی میں اپنے معبود کو تلاش کریں۔ وہ برملا کہا کرتا تھا کہ تم "مذہب کے بارہ میں ادھر ادھر کی باتوں کو چھوڑ دو اور اس حقیقت کو مضبوطی سے تھام لو کہ سچے مذہب کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ تم روح کی تطہیر کے ساتھ اللہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاؤ"[۲]

دین کو کتابوں کی بجائے ہر ہر انسان کے قلب و ذہن پر مرتسم ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہربرٹ (HERBERT) کے الفاظ میں دلیل کا اسلوب یہ تھا۔

"اگر ہم سچائی کے ادراک پر قادر ہیں تو ہمارے قلب و ذہن میں اس کے لیے ایسی صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے کہ جن کے بل پر ہم سچائی کو پالینے میں کامیاب ہو سکیں"[۳]

یہ لوگ قلب و ضمیر اور ذہن و فکر کی کاوشوں سے جن نتائج تک پہنچ پائے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بلاشبہ ایک اعلیٰ اور مقدس ذات موجود ہے۔

۲۔ اس ذات کی پرستش ہونا چاہیے۔

۳۔ پرستش کا بہترین طریق نیکی اور پاکیزگی اختیار کرنا ہے۔

۴۔ الحاد اور جرائم سے توبہ کرنی چاہیے۔

۵۔ خیر و شر کا بدلہ اُخروی زندگی میں ملے گا۔

مذہبِ فطرت کے متعلق ایک صاحب کی یہ تنقید بہت تیکھی بھی ہے اور صحیح بھی کہ نہ یہ مذہب ہے اور نہ فطرت ہے۔ فلسفہ کی اصطلاح میں اس نوع کی ترکیب لفظی کو ہم ایسے تناقض سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کے دونوں جز ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ مذہب ایک قسم کا تعین چاہتا ہے۔ حتمیّت کا متقاضی ہے اور استفادہ و حصولِ فیض کے لیے ایسے مصدر و سرچشمہ کی طرف انتساب رکھتا ہے کہ جو شک و ریب کے کانٹوں سے بالکل محفوظ ہے اور فطرت پر مبنی قوانین اس کے برعکس ایک طرح کی وسعت اور ابہام لیے ہوتے ہیں۔ مزید برآں ان میں حتمیت واذعان

---

[۲] اے ہسٹری آف ماڈرن فلاسفی۔ ہانی ہا فڈنگ پہلی جلد ص ۶۳ [۳] ایضاً، ص ۶۵

کے بجائے فکر و تعمق کے الجھاؤ ہیں اور دانش و عقل کے پیدا کردہ شکوک ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ فطرت ایک حد تک ضرور رہنمائی کرتی ہے مگر اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو پاتا کہ جس سے ایک نظامِ حیات کی تعمیر ہوتی ہے اور زندگی کا ایک متعین نقشہ اُبھرتا ہے۔ فطرت مثلاً یہ ضرور بتاتی ہے کہ خیر، شر سے بہتر ہے لیکن اسی خیر کو پیچیدہ اور وسیع تر زندگی کے گوشوں پر ہم کیونکر منطبق کر سکتے ہیں۔ اس بارے میں فطرت بالکل خاموش ہے۔ فطرت اس حد تک قطعی ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ عدل اور بالخصوص اجتماعی عدل فرد اور معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لیے بہت ضروری ہے لیکن صرف اس سے اگر ہم چاہیں کہ کسی مخصوص نظام کو ترتیب دے سکیں کہ جو جور و تعدی اور ظلم و استحصال کی ہر ہر صورت کا قلع قمع کر دے تو ہمیں کامیابی نہیں ہوگی۔ فطرت کی رہنمائی اس سلسلہ میں صرف اصول کی حد تک ہے۔ ان ضروری تفصیلات و فروع کا استنباط کہ جس سے تہذیب و تمدن کا نگار خانہ بنتا ہے۔ اس میں ہمیشہ بحث و تمحیص کا ہدف رہے گا۔

تعجب ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے وجود کو تو تسلیم کیا ہے مگر اس کے لوازم کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ موجود ہے اور اسی نے دنیا کے اس عظیم ترین مادی نقشہ کو ترتیب دیا ہے تو ضروری ہے کہ وہ ذاتِ گرامی زندگی کے اخلاقی و اجتماعی نقشہ کو بھی مرتب کرے اور وہ انسان جو اس کی ساری کائنات میں منفرد اور مایہ ناز تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی شفقت بے پایاں اور رحمتِ غیر محدود سے محروم نہ رہے۔ اگر اللہ تعالیٰ خلاق ہے اور اس کے ساتھ پروردگار بھی ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ دشتِ امکاں کو تو سجائے اور دبستانِ حیات میں گل بوٹوں کی پرورش کا اہتمام تو کرے لیکن اس انسان کی تکمیل و ارتقا کے تقاضوں سے دلچسپی نہ رکھے جس سے اس کی رونق قائم ہے؟ مذہبِ فطرت کے ماننے والوں نے اس نکتہ پر غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کو مان لینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم نے مذہب و دین کی ضرورتوں کو تسلیم کر لیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ماننے کی ضرورت ہی اس بنا پر پیدا ہوتی ہے کہ عقل و استعداد میں محدود انسان اس غیر محدود ذات سے استعانت چاہتا ہے جو اس کی زندگی میں دخیل اور کارفرما ہو، جو اس کے قلبی و ذہنی خلفشار سے آگاہ اور اس کی ذہنی نارسائیوں سے آشنا ہو یعنی جو اس لائق ہو کہ اس کے لیے زندگی کی راہوں کو متعین، ہموار اور خوشگوار بنا سکے۔

مذہب فطرت سے اگرچہ ہم متفق نہیں ہو سکتے مگر اس کے پس منظر میں جو روح اور فکر پنہاں ہے اس سے انکار نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ استناد کے دائروں کو صرف اسی حد تک وسیع ہونا چاہیئے کہ جس سے تہذیب و تمدن کا خوبصورت اور قابلِ عمل مرقع تیار ہو سکے۔ اس کو بے جا پابندی، فضول قدغن اور بے معنی طوق و سلاسل کی شکل نہیں اختیار کرنا چاہیئے کہ جس سے خود زندگی گھٹن محسوس کرنے لگے۔ نیز اس کے احکام و فروع میں اس درجہ لچک کا ہونا ضروری ہے کہ جس کے بل پر ہر ہر دور میں انسان اجتہاد و قیاس کی طرفہ طرازیوں سے تاریخ کی کروٹوں کا ساتھ دے سکے۔ ورنہ یہ خطرہ ہے کہ تہذیب کہیں متحجر ہو کر نہ رہ جائے۔

مزید برآں مذہب و دین کے بارہ میں یہ نکتۂ باریک تر بھی خاص التفات چاہتا ہے کہ اگر یہ ایسی شاخ در شاخ تفصیلات ہی سے تعبیر ہے کہ جن میں زندگی کے ہر ہر گوشہ اور جزئیہ سے تعرض کیا گیا ہے اور کسی بھی مسئلہ کو تشنہ و تکمیل نہیں رکھا گیا۔ تو سوال یہ ہے کہ اس صورت میں فکر و اجتہاد کی تازہ کاریوں کے لیے کیونکر گنجائش پیدا کی جائے گی اور یہ مذہب بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ کیونکر دے سکے گا۔ اس بنا پر ایک صحیح قابلِ عمل اور متوازن مذہب کے لیے ضروری ہے کہ اس میں نہ تو اتنا پھیلاؤ ہو کہ جس کو وقت کے تقاضے سمیٹ ہی نہ سکیں اور نہ اس درجہ اختصار ہو کہ جس سے زندگی کا کوئی نقشہ ہی متعین نہ ہو پائے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اعتدال اور سچائی کی راہ ان دونوں کے بین بین ہے۔

مذاہبِ جدیدہ میں جس فلسفۂ حیات نے فرد کے مسئلہ کو خصوصیت سے اپنایا ہے وہ وجودیت (Existentialism) ہے اس کے حامیوں نے سقراط کے بعد پہلی دفعہ افرادِ انسانی کی بیچینی اور اضطراب کو فکر و تعمق کا موضوع ٹھہرایا اور کوشش کی کہ انسانی آلام کا باقاعدہ تجزیہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان کی تہ میں کن مجبوریوں کا دخل ہے اور ہم کس حد تک ان مجبوریوں پر قابو پا سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ مذاہب و ادیان اور ان تمام اجتماعی اور سیاسی نظریات سے بیزار ہیں کہ جن کی وجہ سے انسانی آلام نہ صرف یہ کہ قطعاً کم نہیں ہوئے ہیں بلکہ اور بڑھے ہیں انھوں نے پہلی عالمی جنگ کی ہولناکیوں کو بچشمِ خود دیکھا ہے اور اس بات کا اندازہ کیا ہے کہ جہاں بے شمار گردنیں کٹی ہیں، بے شمار خاندان تباہی اور ہلاکت کے غار میں ڈھکیل دیے گئے ہیں۔

اور بے شمار انسان بموں اور گیسوں کا شکار ہونے کی وجہ سے بے کار اور مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہاں کسی طرح بھی مذہبی و دینی اقدار، سیاسی نظریے اور اخلاقی و روحانی تنظیمیں انسان کو اس خون آشامی سے باز نہیں رکھ سکے۔ بلکہ الٹے متحارب گروہوں نے ان عالمی اداروں، تنظیموں اور اخلاقی و روحانی قدروں کو اشتعال انگیزی کے لیے استعمال کیا۔ اس صورتِ حال سے وجودیت کے حامی مفکرین اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی بھی اجتماعی تنظیم اس بات کا خیال نہیں رکھ سکتی کہ ایک انسان، ایک فرد اور ایک شخص کے مسائل کیا ہیں۔ وہ مشکلات و آلام کی کس نوعیت سے دوچار ہے۔ اور کیونکر ایک فرد کی حیثیت سے ان سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ مایوسی اور قنوط کے اس پس منظر نے فکر و نظر کا جو نقشہ ترتیب دیا اس کا ماحصل یہ تھا کہ ہر ہر انسان کو مذاہب و ادیان سے کنارہ کش ہو کر اپنا مستقبل خود تعمیر کرنا چاہیے۔ عالمی اور اجتماعی نظریات سے ہٹ کر اپنی امنگوں اور خواہشوں کا خود احترام کرنا چاہیے اور زندگی کے تضادات میں خود اپنی پسند اور اختیار (Choice) سے ایسا اسلوب اپنانا چاہیے جو زیادہ سے زیادہ مسرتوں اور کامرانیوں کو اس کے دامن میں ڈال دینے کا ضامن ہو۔

فلسفۂ وجودیت کا دو لفظوں میں خلاصہ یہ ہے کہ اس کے نقطۂ نظر سے وجود (Being) اور پسند یا اختیار (Choice) کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ وجود کے معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی پر شاعرانہ انداز سے ہٹ کر حقیقت پسندانہ غور کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ فطرت کے وسیع و عریض کارخانے میں اس کی آخر اہمیت کیا ہے؟ انسانی زندگی کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ بحرِ عدم کی یہ ایک حقیر موج ہے جو لمحہ بھر کے لیے اٹھی اور پھر ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی اور اس کے ساتھ اس کی امنگیں، ولولے اور تہذیبی و عمرانی نصب العین سب ختم ہو گئے۔ یعنی اس حقیر سی زندگی کا مآل جو لمحہ بھر کے لیے سطحِ وجود پر چمکتی ہے موت یا کامل عدم ہے جس سے دوچار ہونا ہے اور ہیچ کھیت ہونا ہے اور ایک شخص یا فرد کی شمع حیات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل کر دینا ہے۔ یہی نہیں اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیتا ہے، اس کی تمام روحوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے اور ان تمام ذہنی صلاحیتوں فکری و علمی ترقیوں اور کردار و سیرت کی استواریوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے کہ جن

کے بل پہ اس نے زندگی کے ان چند اور پتلے لمحوں کو بسر کیا۔ موت کو یہ لوگ ایک طرح کا اہمال (Absurdity) تصوّر کرتے ہیں کہ جس کے پیچھے کوئی منطق، کوئی قاعدہ اور اخلاقیات کارفرما نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ زندگی اور موت کے بارہ میں یہ حقیقت پسندانہ تصوّر ہی ایسی چیز ہے کہ جس سے عمل کا صحیح اسلوب متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس تصوّر سے دو باتیں بالکل واضح طور پر سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ فطرت کو انسانی زندگی، انسانی تہذیب اور انسانی ترقیات یا امنگوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ دوسرے یہ کہ جب صورتِ حال یہ ہے کہ فطرت انسان کے معاملہ میں غیر جانبدار ہے تو کوئی شخص بھی اس بات کی تکلیف گوارا نہیں کرے گا کہ خواہ مخواہ عالمی تصوّرات یا دینی عقاید کا بوجھ اُٹھائے پھرے۔ اس کو اگر اس مختصر اور بے مقصد زندگی کے چند لمحوں کو خوشگوار بنانا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے ہر ہر نازک موڑ پہ اپنے لیے راہ عمل تجویز کرے۔ اس تجویز یا پسند کے معنی یہ نہیں کہ وہ مروجہ اصولوں کی مخالفت کرے یا اس نظامِ حیات کو جھٹلائے کہ جو معاشرہ میں دائر و سائر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سعی و تگ و دو اور عمل کا اصل محور اپنی اور انسانی ذات ہے قاعدے قانون یا تصورات نہیں، اس لیے جہاں جہاں اس نوعیت کا تضاد پیدا ہو کہ سوسائٹی کچھ چاہتی ہے اور اس کی ذاتی مسرتیں اور ذاتی مفادات کچھ اور چاہتے ہیں تو اس کا فرض ہے کہ خوب دیکھ بھال لے کہ کیونکر اس تضاد سے مخلصی حاصل کر سکتا ہے اور کس طرح اس آب و ہوا میں رہتے ہوئے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مسرتوں کی مقدار اپنے دامنِ زیست میں سمیٹ سکتا ہے۔ (باقی آئندہ)